تہذیبوں کی کایا کلپ

ہندو، بودھ، چینی، پارسی، یہودی، عیسائی اور اسلامی تہذیب کا ارتقا

کیرن آرمسٹرانگ

ترجمہ: پروفیسر حنیف کھوکھر

مشعل

فہرست

-1	محوری قومیں	(اندازاً 1600 تا 900 قبل مسیح)	18
-2	رسوم	(اندازاً 900 تا 800 قبل مسیح)	80
-3	نفیءذات	(اندازاً 800 تا 700 قبل مسیح)	128
-4	آگہی	(اندازاً 700 تا 600 قبل مسیح)	179
-5	دکھ	(اندازاً 600 تا 530 قبل مسیح)	232
-6	یگانگت	(اندازاً 530 تا 450 قبل مسیح)	280
-7	سب کی فکر	(اندازاً 450 تا 398 قبل مسیح)	336
-8	تمام اشیاء ایک ہیں	(اندازاً 400 تا 300 قبل مسیح)	398
-9	سلطنت	(اندازاً 300 تا 220 قبل مسیح)	456
-10	ہمارا مستقبل		507
	اصطلاحات		551

MashalBooks.com

MashalBooks.com

ابتدائیہ

شاید ہر دور کے لوگ یہ سوچتے ہیں کہ انسانی تاریخ کسی اہم موڑ سے گزر رہی ہے اور دنیا میں کوئی اہم اور انقلابی تبدیلی رونما ہونے والی ہے۔ تاہم اگر جائزہ لیا جائے تو ہمارے مسائل کچھ زیادہ ہی گمبھیر محسوس ہو رہے ہیں اور ہمارا مستقبل دوسرے زمانوں کی نسبت کچھ زیادہ ہی غیر یقینی دکھائی دیتا ہے۔ اور دکھ کی بات یہ ہے کہ اس گمبھیرتا اور بے یقینی میں کوئی کمی آنے کے بجائے اس میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ظلم و استبداد اور جبر و تشدد کا جو رجحان ہمیں حالیہ دور میں نظر آتا ہے، اس کی نظیر شاید پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ہماری بے مثل اقتصادی اور سائنسی ترقی کے ساتھ ساتھ ہماری ایک دوسرے کو گھاؤ لگانے اور ایک دوسرے کو زک پہنچانے کی استعداد میں بھی کوئی کم اضافہ نہیں ہوا ہے۔ لگتا ہے کہ ابھی ہم میں اس ذہن اور سوچ کی کمی ہے کہ جس سے ہم اپنے متشددانہ رجحانات کو قابو میں لا سکیں اور اسے مناسب حدوں میں رکھ کر ایک دوسرے کو تکلیف اور ایذا رسانیوں سے بچا سکیں۔ ہیروشیما اور ناگا ساکی کے اندوہناک واقعات ہماری جدید تہذیب کی قلعی پہلے ہی کھول چکے ہیں اور اس کے عقلی اور سائنسی معرکوں میں پنہاں تباہی اور بربادی کو ہم پر پہلے ہی عیاں کر چکے ہیں۔ اب لگتا ہے کہ ہم کسی بہت بڑی ماحولیاتی تباہ کاری کے دھانے پر کھڑے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اس زمین کے تقدس کو پامال کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور اپنے مفاد اور مطلب براری کے لیے محض ایک ذریعہ سمجھتے ہوئے اس کے ہر طرح کے استحصال کو جائز خیال کرتے ہیں۔ اگر ہم اپنی روحانی دنیا میں کوئی اس پائے کا انقلاب عمل میں نہیں لاتے کہ جس پائے کا انقلاب ہم نے سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبے میں بپا کیا ہے تو ہمارے اس خوبصورت کرۂ ارض کی بقا کی کوئی ضمانت دینا مشکل ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے بچوں کے لیے صرف سائنسی اور منطقی تعلیم ہی کافی نہیں ہے۔ ہم پر پہلے ہی یہ تلخ

Mashalbooks.com

حقیقت کھل چکی ہے کہ اگر کسی آبادی میں تعلیم کی کوئی ایک بڑی شاندار درسگاہ کام کر رہی ہو تو اسی آبادی میں نازی کیمپوں جیسا کوئی انتہائی کریہہ اور غیر انسانی عقوبت خانہ بھی وجود میں آ سکتا ہے۔ یہ اکتسابی علم کوئی ایسی اکسیر ثابت نہیں ہو سکا کہ جس سے سب دلدّر دور ہو جاتے اور ہمارے سارے معاشرتی اور تہذیبی مسائل حل ہو جاتے۔ بوسنیا، روانڈا، مشرق وسطیٰ میں رونما ہونے والے خونی واقعات اور نیو یارک کے عالمی تجارتی مرکز پر ڈھائی جانے والی تباہی ہم پر یہ بات آشکارہ کرنے کے لیے کافی ہے کہ اگر ہمارے ذہن سے انسانی جان کے تقدس اور تکریم کا تصور محو ہو جائے تو ہماری یہ زمین کتنے ہولناک مناظر پیش کر سکتی ہے۔

مذہب، جس سے اس نوع کے مثبت تصورات پیدا کرنے کی توقع کی جا سکتی ہے، آج کے دور میں الٹا جبر و تشدد اور ظلم استبداد کو ہوا دیتا محسوس ہوتا ہے۔ اب تو ہر دن دین و مذہب کے نام پر پروان چڑھنے والی دہشت گردی، نفرت اور عدم رواداری کی نت نئی مثالیں اور مظاہر ہمارے سامنے آنا شروع ہو گئے ہیں۔ لوگوں کی ایک بڑھتی ہوئی تعداد ادیان و مذہب سے لاتعلق ہو چکی ہے اور سمجھتی ہے کہ روایتی مذہبی رسوم و مناسک اس جدید دور سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ لوگ ان مذہبی معاملات میں یقین اور دلچسپی کھو کر رقص و موسیقی، کھیل، منشیات، آرٹ اور ادب کی طرف راغب ہو رہے ہیں تاکہ ان سے وہ ماورائے ارضی تلطف اور آنند حاصل کیا جا سکے کہ جس کی جستجو انسانی روح ہمیشہ سے کرتی چلی آئی ہے۔ ہم سب کا ذہن ہمیشہ ایسے لمحات کی تلاش میں رہتا ہے جب انسان اپنی ذات میں موجود انسانی عنصر کے شعور کو زیادہ شدت سے محسوس کرنے لگتا ہے اور اس کے اندر کا احساس دوسرے عام اوقات کی نسبت زیادہ گہرا ہو جاتا ہے اور وہ لمحاتی طور پر اپنے آپ کو اپنے آپ سے بالا محسوس کرنے لگتا ہے۔

انسان ایک معانی جُو حیوان ہے۔ ہم سب ہر معاملہ حیات میں معانی اور مقصد تلاش کرتے رہتے ہیں اور اگر یہ معاملات معانی سے عاری ہوتے نظر آئیں تو دوسرے حیوانات کے برعکس ہم بہت جلد حزن و یاس کا شکار ہو جاتے ہیں۔

موجودہ دور میں انسانی معاشرے میں بسنے والے ہمارے بہت سے بھائی بند اپنے مذہبی شعور کے اظہار کے لیے نئی نئی راہوں کے متلاشی نظر آتے ہیں۔ گزشتہ صدی کے ربع آخر سے دنیا کے مختلف حصوں میں روحانی و مذہبی احیاء کی مختلف تحاریک دیکھنے میں آ رہی ہیں اور وہ مذہبی عسکریت پسندی اور بنیاد پرستی کہ جس کا مشاہدہ آج کے دور میں ہم ہر طرف کر رہے ہیں وہ بھی

دراصل ایک زیادہ خوبصورت اور بابصیرت معاشرے کی منزل کے حصول کی طرف انسان کی مابعد جدید جدوجہد کا ہی ایک مظہر ہے۔

مجھے قوی امید ہے کہ ہم آج کے دور کے کرب کا درماں تلاش کرتے وقت تاریخ انسانی کے اس اہم اور ممتاز دور سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں جسے جرمن دانشور کارل جیسپرز نے محوری دور کا نام دیا ہے کیونکہ اس عہد کو انسان کی روحانی نشوونما کے اعتبار سے ایک مرکز اور محور کی حیثیت حاصل ہے۔ اگر ہم بشری تہذیب کے ماضی کا جائزہ لیں تو 900 ق م سے 200 ق م تک کے زمانے کے دوران ہمیں دنیا کے چار مختلف خطوں میں چار ایسی عظیم روایات وجود میں آتی نظر آتی ہیں جن سے انسانی معاشرہ آج تک فیض حاصل کر رہا ہے۔ ان چار روایات سے میری مراد چین کا کنفیوشس مت اور تاؤمت، ہندوستان کا ہندومت اور بدھ مت، اسرائیل کا دین وحدانیت اور یونان کی عقلی تحریک ہے۔

زیر بحث محوری دور دراصل گوتم بدھ، سقراط، کنفیوشس، یرمیاہ!، مینسی لیس، یوری پیڈیس اور اپنشدی رشیوں کا زمانہ ہے۔ اس بھرپور تخلیقی دور کے ارباب فکر ونظر نے ایک بالکل جداگانہ طرز کے انسانی تجربے کا باب وا کیا۔ ان نابغۂ روزگار ہستیوں میں سے بہت سے تو گمنام رہے لیکن بعض نے اتنی شہرت پائی کہ وہ آج تک قائم ودائم ہے۔ ان فلسفیوں اور خرقہ پوشوں کے نام سن کر آج بھی ہمارا سر احترام سے جھک جاتا ہے اور دل جذبۂ ممنونیت سے بھر جاتا ہے کیونکہ یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے انسان کے لیے صحیح راستے کی نشاندہی کرنے کی سعی کی اور انسانی معاشرے میں تشدد و غاصبیت کے رجحانات کے سدباب کے لیے اپنا کردار ادا کیا۔

محوری دور کا شمار ہم ان اہم ادوار میں کر سکتے ہیں جو معلومہ تاریخ انسانی کے اہم ترین عقلی، نفسیاتی، مذہبی اور فلسفیانہ انقلابات کی بنیاد بنے۔ ہمارے اس جدید دور میں اس محوری دور کی اگر کوئی نظیر ملتی ہے تو صرف اس اہم مغربی انقلاب کی صورت میں جس نے آج کے دور میں دکھائی دینے والی جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کی سلسلہ جنبانی کی۔

محوری دور کے بارے میں پیش کردہ میرے مؤقف کے جواب میں کوئی شخص یہ سوال اٹھا سکتا ہے کہ اس دور کے یہ مشاہیر کہ جن کا تعلق ایک یکسر مختلف دنیا سے تھا، آج کے زمانے کے مسائل کا توڑ کیسے پیش کر سکتے ہیں یا یہ کہ ہم اس جدید دنیا کے انسان گوتم اور کنفیوشس یا ان کی تعلیمات کی طرف کیونکر رجوع کریں۔ بات کسی حد تک ٹھیک بھی ہے۔ ایسے دور افتادہ دور کے

MashalBooks.com

مطالعے کو محض روحانی آثار قدیمہ کی سیر کے مترادف ہی قرار دیا جا سکتا ہے جبکہ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ کوئی ایسی نئی روایت تشکیل دی جائے کہ جو ہماری اس جدید دنیا اور اس کے عصری تقاضوں کی غماز ہو اور ان سے تسلی بخش طور پر عہدہ برآ ہو سکے۔

گزشتہ سطور میں ہم نے جو کچھ کہا سنا، وہ اپنی جگہ پر لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہماری فکر آج بھی محوری دور کی فہم و فراست سے آگے نہیں نکل سکی۔ سچ یہ ہے کہ ہر روحانی اور سماجی بحران میں انسان نے رہنمائی کے لیے ہمیشہ پلٹ کر اسی دور کی طرف دیکھا ہے۔ ممکن ہے کہ مختلف ادوار کے لوگوں نے محوری دریافتوں کی توضیح و تعبیر مختلف انداز سے کی ہو لیکن یہ بات ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ آج تک کوئی دور بھی ان سے سبقت لینے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ مثلاً یہودیت، اور عیسائیت جیسی روایات فی الحقیقت اسی محوری دور میں لگائے گئے اشجار کی کونپلیں ہیں۔ جیسا کہ ہم اس کتاب کے اختتامی باب میں دیکھیں گے، ان مذہبی روایات نے درحقیقت محوری دور کی فکر سے ہی اکتساب کیا تاہم ان کے شارحین نے اپنے کمال تدبر سے اسے ایک ایسے محاورے میں تبدیل کر لیا کہ جو ان کے اپنے ادوار کے تقاضوں کے عین موافق تھا۔

محوری دور کے صاحبان فکر و دانش کی بصیرت اس قدر خالص اور گاڑھی تھی کہ بعد میں آنے والی نسلوں کو اس میں پانی ملا کر اسے رقیق کرنا پڑا۔ اس عمل کے دوران اکثر اوقات یوں بھی ہوا کہ نئے دانشوروں نے بالکل اس طرح کی ایک صورت حال کو جنم دے ڈالا کہ جس طرح کی صورت حال سے محوری مصلحین نجات حاصل کرنے کی فکر میں تھے۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے اس جدید دور میں بھی یہی کچھ ہوا ہے۔

محوری دور ہمیں ایک پیغام دیتا ہے اور لامحالہ وہ ہے بھی بہت اہم لیکن اس پیغام سے شاید ان بہت سے افراد کو بہت دھچکا محسوس ہو کہ جو اپنے آپ کو بڑا مذہبی خیال کرتے ہیں۔ مثلاً اکثر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مذہب محض بعض رسومات کو بجالانے اور بعض فوق الفطری عقیدوں پر ایمان رکھنے کا نام ہے۔ بلکہ ہم جانتے ہیں کہ مذہبی لوگوں کو 'اہل ایمان' کہہ کر پکارا جانا بھی عام ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی مذہب کے عقائد و مناسک کی محض توثیق ہی اس کے پیروکاروں کا اصل کام ہے۔ لیکن اس کے برعکس بیشتر محوری فلسفی اور حکماء کسی خاص عقیدے یا مابعد الطبیعیات سے سرے سے کوئی دلچسپی ہی نہیں رکھتے تھے۔ مہاتما بدھ جیسے کسی شخص کے لیے تو کسی کے مذہبی اعتقادات چنداں اہمیت کے حامل ہی نہ تھے۔ اس دور کے بعض دانشور تو مذہبی معاملات پر بات کرنے سے

بھی گریزاں نظر آتے تھے اور یہ مؤقف پیش کرتے تھے کہ ایسے معاملات پر بحث وتمحیص گمراہ کن اور مضر ہے۔ ان میں سے بعض حضرات کی دلیل یہ تھی کہ کسی ایسے کامل یقین، جیسا کہ لوگ مذاہب سے ملنے کی توقع کرتے ہیں، کی جستجو ہی سرے سے غیر عاقلانہ اور غیر حقیقت پسندانہ ہے بلکہ یہ ایک طرح کی بے راہروی کے مترادف ہے۔

محوری دور میں پہنچنے والی تمام روایات نے انسانی شعور کی حدوں کو وسعت دی اور انسانی ذات کے اندر کی روحانی جہت کو دریافت کیا۔ قابل غور بات یہ ہے کہ ان روایات کے مطابق یہ روحانی جہت کوئی فوق العادت معاملہ نہیں ہے بلکہ ان میں سے بیشتر روایات کے علمبردار تو اس مسئلے کو بحث میں لانے کے ہی خلاف رہے ہیں۔ ذرا سوچیے کہ آخران کے اس رویے کی وجہ کیا تھی۔ اس کی وجہ درحقیقت محوری زعما کا یہ نظریہ تھا کہ جس تجربے کو الفاظ کی قید میں نہیں لایا جا سکتا بہتر ہے کہ اس پر زبان بند ہی رکھی جائے اور تعظیمانہ خموشی اختیار کی جائے۔

ان ارباب خرد و نظر نے ازلی حقیقتوں کے بارے میں اپنے کسی نظریے کو کبھی دوسروں پر مسلّط کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ان کا خیال تو یہ تھا کہ کسی بھی شخص کو مذہب و روحانیت کی تعلیم کسی دوسرے سے لینا ہی نہیں چاہیے۔ ان کے نزدیک ہر شے کی پرکھ پڑچول لازم تھی اور یہ ضروری تھا کہ کسی بھی قسم کے عقیدے یا نظریے کو پہلے تجربیت کی کسوٹی پر رگڑ کر دیکھا جائے اور فقط اپنے ذاتی تجربے پر ہی اکتفا نہ کیا جائے۔ ہاں، اگر ہماری تہذیبی تاریخ میں کسی حکیم یا دانشور نے کسی نظریے کے تلازم یا اس کے مطلقاً سچے ہونے پر زور دیا ہے تو اسے ہم محوری دور کے آدرشوں کے محض ضعف میں آنے کے آثار پر ہی محمول کر سکتے ہیں۔

میں سوچتی ہوں کہ اگر مہاتما بدھ یا کنفیوشس سے یہ سوال کیا جاتا کہ صاحب کیا آپ کسی آسمانی ہستی پر یقین رکھتے ہیں تو شاید وہ کچھ چونک سے جاتے اور پھر بڑی شائستگی سے جواب دیتے کہ بھیا آپ کا یہ سوال کرنا مناسب نہیں ہے۔ اگر کسی نے عاموسؑ یا عزقائیلؑ کے سامنے یہ سوال اٹھایا ہوتا کہ کیا آپ موحّد ہیں تو یقیناً وہ بھی اسی اچنبھے کا اظہار کرتے۔ ان کے لیے موحد ہونا یا وحدانیت کوئی قابل بحث مسئلہ ہی نہ تھا۔ بائبل میں بھی وحدانیت کے ضمن میں کم ہی کوئی کڑے احکام ملتے ہیں اور اگر چند ایسے احکام یا بیانات ملتے بھی ہیں تو ہم ان کی کرختگی کو محوری روایات سے محض روگردانی سے ہی تعبیر کر سکتے ہیں۔

محوری روایت میں اس چیز کی چنداں اہمیت نہ تھی کہ آپ کا عقیدہ کیا ہے بلکہ یہ بات اہم تھی

کہ آپ کا رویہ یا اخلاق کیسا ہے۔ اس دور میں مذہب سے مراد ایسے اعمال تھے جو انسان کی اندر سے کایا کلپ کر سکیں اور اسے ایک بہتر اور نافع انسان بنا سکیں۔ محوری دور سے قبل جانوروں کی قربانی اور اس طرح کی دوسری رسومات مذہب میں مرکزی حیثیت رکھتی تھیں۔ لوگ ذات اقدس کا تجربہ مذہبی ناٹکوں کے توسط کرتے تھے جو انہیں زندگی کی ایک دوسری ارفع اور اعلیٰ تر جہت سے روشناس کرنے کے لیے پیش کیے جاتے تھے۔ بعینہ اسی طرح کے تجربے سے ہم بعض اوقات آج کے تھیٹر کے بعض عظیم تخلیقی مظاہروں کی وساطت بھی دوچار ہو سکتے ہیں۔

محوری دور میں آ کر ان قدیم ریتوں اور رویوں میں بہت سی تبدیلیاں ظہور پذیر ہوئیں۔ محوری حکماء بھی مذہبی رسوم و روایات کے کوئی ایسے انکاری نہ تھے لیکن انہوں نے انھیں ایک نئے اخلاقی معانی پہنائے اور اخلاقیات کو روحانی اور مذہبی زندگی کا مرکز بنا دیا۔ ان کے مطابق واحد راستہ جس سے آپ خدا پر یقین یا نروان حاصل کر سکتے ہیں وہ دوسرے ذی روحوں سے ہمدردی اور ان پر شفقت و مہربانی کا راستہ ہے۔ اصل میں ان کے لیے مذہب نام ہی صرف رحم دلی اور دردمندی کا تھا۔ آج کے زمانے میں ہم سوچتے ہیں کہ ہمیں اگر مذہبی زندگی اختیار کرنا ہے تو پہلے ہمیں اس بات کا مکمل ثبوت حاصل کر لینا چاہیے کہ کائنات میں خدا یا بھگوان واقعی موجود ہے؟ اسے ہم تو شاید ایک اچھا سائنسی قاعدہ کہہ سکتے ہیں کہ پہلے آپ کسی اصول کی صحت کو ثابت کرتے ہیں اور بعد میں اس کا اطلاق کرتے ہیں لیکن محوری علماء کے نزدیک یہ بات الٹی گنگا بہانے کے مترادف تھی۔ ان کے نزدیک سب سے پہلے آپ کو اعلیٰ اخلاقی رویوں کو اپنی ذات و کردار میں جاری و ساری کرنا چاہیے۔ عدل و خیر کے یہ جذبے جب راسخ ہو کر آپ کی فطرت ثانیہ کی شکل اختیار کرتے ہیں تو آپ کو اس ذاتِ بالا سے قرب بھی نصیب ہو جاتا ہے جس کی آپ تلاش کر رہے ہوتے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ یہ قرب کسی مابعدالطبیعیاتی عقیدے یا ایقان سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

اس سے ان کا مطلب یہ تھا کہ آپ کو اپنے اندر تبدیلی لانے کے لیے پہلے اپنے ذہن و قلب کو تیار کرنا پڑتا ہے۔ وہ اپنے شاگردوں اور مریدوں کو کسی ایسے عارضی تجربے میں سے گزارنے میں ہرگز دلچسپی نہیں رکھتے تھے کہ جس میں سے گزرنے کے بعد مرید اور زیادہ توانائی کے ساتھ دوبارہ اسی معمول کی منفی اور کمینہ زندگی پر لوٹ آتے۔ ان اہل دانش کا مطمح نظر ایک قطعی جداگانہ طرز کے انسان اور انسانی شخصیت کو وجود میں لانا تھا۔ ان سب نے رحم دلی، خدا ترسی اور

MashalBooks.com

دردمندی کے مذہب کی ترویج وتبلیغ کی۔ان کی جستجو یہ تھی کہ انسان کے اندر کے حرص وہوس کے رجحانات کا سدباب کیا جا سکے۔ان کے لیے کسی دوسرے انسان کو چھری یا بھالے سے قتل کرنا ہی جرم نہ تھا بلکہ ان کی تبلیغ یہ تھی کہ انسان کو کوئی سخت لفظ بولنے یا کوئی مضر اشارہ کرنے سے بھی اجتناب کرنا چاہیے۔مزید برآں تقریباً سب ہی محوری حکماء کا خیال تھا کہ ہماری خیروشفقت صرف قرابت داروں اور اپنے آس پاس کے لوگوں تک ہی محدود نہیں رہنا چاہیے بلکہ اس خیروشفقت کی ضو بلاتمیز وتفریق سب عالم کے باسیوں تک پہنچنا چاہیے۔بعد میں جب اس زمین کے باسیوں کا ظرف نظر سمٹنا شروع ہوا، ان کے افق تنگ ہونا شروع ہوئے اور ان کے پیار ومحبت نے حدیں قائم کرنا شروع کر دیں تو یہ گویا محوری دور کے خیر باد کہنے کی ایک اور علامت تھی۔ بعد میں آنے والی روایات نے اخلاقیات کے سنہری اصولوں کی اپنی جداگانہ طرز پر توضیح وتعبیر کی اور اس جداگانہ توضیح وتعبیر کو بنیاد بنا کر مختلف اوامر ونواہی وضع کیے مثلاً دوسروں کے ساتھ کوئی ایسا عمل نہ کرو جو کہ تم اپنے ساتھ پسند نہیں کرتے، وغیرہ۔ جہاں تک محوری حکماء کا تعلق ہے، دنیا کے تمام ذی روحوں کے مقدس حقوق کی تعظیم ہی ان کا اصل مذہب تھا۔ مذہب ان کے لیے محض کسی خاص عقیدے یا رسوم ورواج کا نام نہیں تھا۔

میرا خیال ہے کہ اگر لوگ محوری روح کو سامنے رکھتے ہوئے دوسرے لوگوں کے ساتھ حقیقی، محبت، شفقت اور فراخ دلی سے پیش آئیں تو ہماری اس خوبصورت دنیا کو تباہی سے بچایا جا سکتا ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ انسانی معاشرے میں اس دور کی اقدار ونظریات کو پھر سے زندہ کیا جائے۔ ہم اپنی اس بستی، جسے ہم کرۂ ارض کہتے ہیں، میں مزید تعصّبات اور تنگ نظری کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ہمیں اپنے اندر ایسے رویے فروغ دینے کی ضرورت ہے کہ جو ہمیں اپنے سے دور دیسوں اور خطوں میں بسنے والے لوگوں کا بھی احترام وتعظیم اس طرح سکھائیں کہ جس طرح کا احترام وتعظیم ہم اپنا یا اپنوں کا کرتے ہیں۔ یہ نہ سوچیے گا کہ محوری دانشوروں نے شفقت ورواداری کے یہ درس کسی دلآویز مرغزاروں میں ندیا کنارے بیٹھ کر وضع کیے تھے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ درس بھی ہمارے جیسے انتہائی ظالم اور پرتشدد معاشروں کی پیداوار ہیں۔

انسان کی روحانی کایا پلٹنے میں جس چیز نے سب سے پہلے مہمیز کا کام کیا وہ ان محوری فلسفیوں کی اپنے چاروں اور پھیلی ظلم وبربریت کی اصولی مخالفت تھی۔ جب ان دانشوروں نے اس تشدد وبربریت کی جڑیں انسان کی روح کی گہرائیوں میں ٹٹولنا شروع کیں تو انہیں انسان کے